اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ اَدب

جنوری ۲۰۱۳

مدیر رانا عبدالرزاق خاں

rana_razzaq@hotmail.com

فون نمبر۔02089449385 07886304637

معاون مدیر و ڈیزائنر

عامر امیر. 07903126126فون نمبر

ویب majeedamir20@hotmail.com

سائٹ۔www.bazmesherosukhan.co.uk

فہرست مضامین صفحہ

۱۔زبان اردو۔رانا عبدالرزاق خاں

۲۔تعلیم۔ابن لطیف

۳۔غزل۔آدم چغتائی

۴۔غزل۔مبارک صدیقی

۵۔غزل۔عامر امیر

۶۔غزل۔عاصی صحرائی

۷۔غزل۔احمد فراز

۸۔دوستی۔عاصی صحرائی

۹۔لطائف۔ادارہ

۱۰۔نیند۔افسانہ۔امجد مرزا امجد

۱۱۔اردو کی رومانی شاعری۔رانا عبدالرزاق خاں

۱۲۔یقین محکم۔عامر امیر

۱۳۔مزاحیہ شاعری

۱۴۔گہرنایاب۔اے آر راجپوت

۱۵۔تعارف کتب۔عاصی صحرائی۔

۱۶۔گزارش

۱۷۔اشتہارات

فنونِ ادب

زبان اردو

رانا عبدالرزاق خاں

فقیروں کے لگائے ہوئے شجر کی آبیاری اور صوفیاء ہند

دہلی کے شہرہ آفاق صوفی حضرت خواجہ میر دردؒ دہلوی(1721ئ۔1785ئ) نے ایک بار فرمایا۔''اے اردو گھبرانا نہیں تو فقیروں کا لگایا ہوا پودہ ہے۔خوب پھلے پھولے گی ۔تو پروان چڑھے گی۔ایک زمانہ ایسا آئے گا۔کہ قرآن حدیث آکر تیری آغوش میں آرام کریں گے۔بادشاہی قانون اور حکیموں کی طباعت تجھ سے آئے گی۔اور تو سارے ہندوستان کی آواز مانی جائے گی''۔(میخانہ در صفحہ 152۔153)مرتبہ جناب ناصر نذیر فراق ساکن کوچہ چیلاں بارہ دری خواجہ میر درد دہلی ۔حیدر برقی پریس دہلی اشاعت مارچ 1910ئ)۔برصغیر کے صوفیا عظام نے اردو کے پودہ کی جس شان وشوکت سے آبیاری کی اور اسے سدا بہار درخت بنانے میں پوری عمر کی صلاحیتیں صرف کر دیں ۔اس کی تفصیل پاکستان کے مورخ و دانشور جناب ڈاکٹر سلیم اختر کے قلم سے ہدیہ قارئین کی جاتی ہے۔فرماتے ہیں۔مشرقی تہذیب اور ثقافت میں دربار مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بادشاہ وقت کی ذات اس کی زندہ علامت، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مخصوص ادوار میں مخصوص اصناف کی ترقی یا تنزل میں دربار اور شاہ کا بالواسطہ تعلق ضرور رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کی سرپرستی اور مربیانہ دلچسپی سے فنکار پرورش پاتے تھے۔اور ادب وفن کو ترقی حاصل ہوتی اتفاق سے دکن میں ادب پرور بادشاہوں کی کمی نہ رہی اور اردو ادب نے جلد ہی منازل ترقی طے کرلیں۔گوشاہانِ بہمنی (748ھ۔932ھ) سے اردو ادب کے آثار تلاش کئے جاسکتے ہیں۔لیکن اصل ترقی قطب شاہی خاندان 916ھ۔ 1098ھ)اور عادل شاہی خاندان(898ھ۔1098ھ) کے بادشاہوں کی ادب پروری کی مرہون منت ہے۔گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کے بیشتر بادشاہ خود بھی شاعر تھے اور اس لئے ان کے دربار میں علمائ،فضلاء اور ادباء دور دور سے کھنچ کھنچ کر آتے اور کمالِ فن کی داد پاتے۔جبکہ بیجاپور میں عادل شاہی خاندان کے بیشتر بادشاہوں نے تو اردو کو

(جو اس وقت ''دکھنی'' کہلاتی تھی) سرکاری زبان مقرر کیا۔سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس سے بھی پہلے صوفیاء کرام نے رشد وہدایت کے لئے جب اس مقامی زبان کو وسیلہ بنایا تو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ بالواسطہ طور سے اردو کی خدمت بھی کر گئے۔ان کی کیونکہ: پر مجھے گفتگو عوام سے ہے۔۔والی بات ہوتی تھی۔اور عوام کی سطح پر آکر عوامی زبان سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ اظہار زیادہ موثر نہیں ہوسکتا۔علاوہ ازیں اور بعض صوفیاء شاعری اور موسیقی کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔اس لئے نادانستہ طور سے وہ حمد وثناء اور اخلاقی پرچار میں ادب بھی تخلیق کرتے گئے۔اس ضمن میں صوفیاء کو صرف جنوبی ہند سے مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ہندوستان بھر میں وہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی مقبولیت اور ادب کی ترقی کا باعث بھی بنے۔چنانچہ مولوی

عبدالحق کی تالیف (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا حصہ) کے مطالعہ سے اس امر کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا۔ مولوی مرحوم اردو کے اولین نمونوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ ''افسوس کہ باوجود تلاش کے ہمیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا کوئی معتبر قول ہندی زبان میں نہیں ملا۔ لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یقینی امر ہے کہ وہ ہندی زبان سے بہت واقف تھے کیونکہ ہندو بھی انکے مسلمانوں سے کم معتقد نہیں'' ہندالولی'' کی ترکیب اور'' غریب نواز'' کا لقب خود ان کی عام مقبولیت کی صاف شہادت دے رہے ہیں۔ البتہ شیخ فرید الدین شکر گنج کے متعدد مقولے ملتے ہیں۔ (ص۹) اس ضمن میں ان صوفیا کرام کے اسماء گنوائے جاسکتے ہیں۔ حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز (1422ئ۔ 1321ئ) '' معراج العاشقین'' معروف ترین تصنیف ہے۔ ان کے والد محترم شاہ راجور یا سید راجہ۔ متوفی 731ھ ہندی کے شاعر تھے۔ شاہ میراں جی شمس العشاق۔ پیدائش 1496ئ (خوش نامہ، ارشادنامہ، شہادت الحقیقت) ان کے فرزند شاہ امین الدین اعلیٰ (رموز السالکین) شیخ عبدالقدوس گنگوہی (945ھ 860ھ) محبوب عالم شیخ جیون متوفی 1004ئ (فقہ ہندی، محشر نامہ) شاہ برہان الدین جانم وفات (1583ئ) شاہ علی محمد جیوگام دھنی (وفات 972ئ) زین الدین الہٰ آبادی متوفی (771ھ) سید محمد اکبر حسینی متوفی (823ھ) صدرالدین چشتی متوفی 876ھ عبداللہ حسینی متوفی 838ھ۔ میراں جی حسن خدا نما متوفی 1070ھ میراں یعقوب متوفی 1078ء شیخ حمیدالدین ناگوری، حضرت بوعلی قلندر، امیر خسرو، شیخ لطیف الدین دریا نوش، شیخ سراج الدین عثمان، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شاہ منیرالدین، شاہ برہان الدین، شیخ احمد لکھنؤ، قطب عالم، شاہ عالم سید محمد جونپوری، شیخ بہائالدین باحق، شاہ محمد غوث گوالیاری، شیخ علی متقی، شیخ رزق اللہ، شیخ وجیح الدین، احمد العلوی، شیخ بہائالدین برناوی، سید شاہ ہاشم الحسنی العلوی، سید میراں حسینی، قاضی محمود دریائی، بیرپوری، میاں خوب محمد چشتی، بابا شاہ حسین اور شاہ محمد معشوق اللہ۔ (رسالہ جواہر الاسرار) صوفیاء کی یہ فہرست تمان ہندوستان پر محیط ہے اگر جنوبی ہند کے صوفیاء کی تخصیص کرتے ہوئے اردو کی ابتدائی نشوونما میں ان کا مقام متعین کرنا ہو تو بقول رام بابو سکینہ جہاں تک کہ تمام قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ نثر اردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شیخ عین الدین گنج العلم متوفی 795ھ کی تصانیف او'' رمعراج العاشقین'' مصنفہ خواجہ گیسودراز گلبرگوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتی مگر پھر بھی اس زمانہ کی زبان کا حال بخوبی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ کے نواسے عبداللہ الحسینی، نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر کے رسالہ نشاط العشق کو'' دکھنی'' میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح شاہ میراں جی شمس العشاق بیجا پوری نے شرح '' مرغوب القلوب'' لکھی اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم متوفی 990ھ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے دو کے نام'' جل ترنگ'' اور'' گل پاس'' ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کی نشوونما میں صوفیاء کے کردار اور اس کی لسانی اہمیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔'' یہ صوفیاء کرام برعظیم کے مختلف علاقوں میں رشد و ہدایت کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ بابا فرید شکر گنج ملتان کے رہنے والے ہیں، شیخ حمید الدین ناگوری وسط ہند کے، بوعلی قلندر پنجاب و ہریانہ کے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

بہارو بنگال کے،امیر خسرو دہلی کے، اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی اودھ کے۔ جو پنجاب میں تھا۔اس کی زبان پر وہاں کی بولی کا اثر ہے۔ جو بہار میں تھا اس کی زبان پر ماگدھی کا اثر ہے۔کسی پر برج بھاشا کا اثر ہے۔ کسی پر کھڑی بولی کا اثر ہے۔کسی پر سرائیکی کا اثر ہے۔تو کسی پر زبان گجرات کا۔لیکن بحیثیت مجموعی اس زبان کا کینڈا، رنگ ڈھنگ بنیادی طور پر ایک ہے۔ اور ابھی چونکہ یہ زبان اپنی تشکیل کے عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ اس لئے یہ اثرات الگ الگ دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ ان نمونوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ زبان اس دور میں ضرورت کی زبان بن کر سارے برعظیم میں پھیل چکی تھی‘‘(اردو ادب کی مختصر تاریخ صفحہ 74 تا 77 ناشر سنگ میل پبلیکیشن اردو بازار لاہور طبع ششم) اردو ایک زندہ زبان ہے۔اردو زبان کی تاریخ ،اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی خوبصورت اور شیریں زبان کا ملخص کسی شاعر نے خوبصورت اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گلریز و گلستاں ہے میری زبان اردو
صورت گر جناں ہے میری زبانِ اردو
آزاد کی حکایت اقبال کا فسانہ
غالب کی داستاں ہے میری زبانِ اردو

اردو زبان کی تاریخ میں آزاد، غالب اور اقبال بلاشبہ اُن ادباء و شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں ۔جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنے کلام کے ذریعہ اردو زبان کو ایک نئی زندگی بخشی۔اہل لکھنو اور اہالیان دلی کا اس زبان پر گرانقدر احسان ہے۔ جنہوں نے ریختہ کو اپنے خون سے سینچا۔اور آج یہ جو شجر سایہ دار نظر آتا ہے۔تو ان دو بڑے شہروں کے ادیبوں کا کمال اور محنت ہے۔اس نوزائیدہ زبان نے مرور زمانہ کے کئی مشکل ادوار بھی دیکھے مگر اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ آخری دور مغلیہ میں اس زبان کو دربار شاہی تک رسائی مل گئی تھی۔سرسید نے بھی اس کی کافی خدمت کی ۔اور یوپی کے صوبے نے تو اسے خوب پروان چڑھایا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ پہلی بار کسی ملک کی قومی زبان ٹھہری۔مگر پھر بھی پاکستان کے دور دراز دیہی علاقوں تک اس زبان کی رسائی مشکلات کا شکار رہی۔اور لوگوں نے اپنی علاقائی زبانوں کو مقدم رکھا۔ یہ قدرتی امر ہے۔ پاکستان میں تو خوب اسے ترویج و ترقی ملی۔تعلیم اداروں اور نصاب تعلیم نے بھی اسے خوب پنپنے کا موقع فراہم کیا۔مگر دیار غیر میں بین الاقوامی طور پر اس کے فروغ کے لئے ایک تنظیم نے بے بہا خدمات انجام دی ہیں۔جس کی مثال ساری دنیا کی تنظیموں میں تلاش بسیار کے بعد بھی ملنا ناممکن ہے۔

تعلیم

(ابن لطیف)

ہر وہ نظامِ زندگی جو اس دنیا کا نظام اپنے مخصوص طرز پر چلانا چاہتا ہو اور اپنے طریقے پر زندگی کے مسائل حل کرنا چاہتا ہو وہ اس مقصد کے لئے افراد کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے اور اپنے اصولوں کے مطابق انسان سازی کا کام سب سے اہم ذریعہ اور طریقہ تعلیم و تربیت ہے۔نظامِ تعلیم نظامِ زندگی کا جزو لاینفک ہے۔اور کسی نظام حیات کی کامیابی کا تمام تر انحصار زندگی کے مجموعی فلسفے سے متاثر ہوتا ہے۔اور اس کو تقویت بھی پہنچاتا ہے۔اگر نظامِ تعلیم آزاد ہو یا فلسفہ حیات سے متصادم ہو تو وہ کامیاب بھی نہیں ہوگا۔اور زندگی کی خدمت سے بھی معذور رہے گا۔تعلیم کی حیثیت نظام حیات کے ایک خدمت گار کی سی ہے۔تعلیم جو اقتدار نمایاں کرتی ہے وہ زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرتی ہے۔اس طرح زندگی کا نظام تعلیم کو

تقویت پہنچاتا ہے ۔ماضی یا حال کے کسی بھی نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی توجہ نظامِ تعلیم کی صحیح تشکیل پر مرکوز کرتا ہے ۔اور اس کو اپنے مجموعی مقاصد اور مزاج سے ہم آہنگ اور مربوط کرتا ہے ۔اسلام جس کو ہم مسلمان ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات مانتے ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں اس کی کامیابی کے لئے بھی نظامِ تعلیم و تربیت کی صحیح تشکیل ضروری ہے ۔یہی وجہ ہے اسلام نے علم کی اہمیت پر بے حد زور دیا ہے قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ میں اس باب میں واضح اشارات ملتے ہیں حضور ﷺ نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے ۔قرآن حکیم نے عالم اور جاہل کو برابر قرار نہ دے کر علم کے بلند مرتبے کو واضح کر دیا ہے قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس میں علم ، عالم معلم اور متعلم کو اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوتا ہے اس معاشرے میں تعلیم کی نعمت عام ہوتی ہے ۔تعلیم پر کسی خاص گروہ ، جماعت یا طبقے کا اجارہ نہیں ہوتا ۔اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کا حق ہی نہیں فرض ہوتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے اس سے بڑھ کر یہ کہ جو مسلمان علم رکھتا ہو اس کا فرض ہے کہ وہ علم دوسروں تک بھی پہنچائے علم کو صرف اپنی جاگیر نہ بنالیں ۔علم کو چھپانا ، حق کو چھپانے کے مترادف ہے مقاصد تعلیم پر بڑی خامہ فرسائیاں ہوتی ہیں ماہرین نے تعلیم کے مقاصد متعین کرنے میں بہت کاوشیں کی ہیں صفحات کے صفحات سیاہ کئے ہیں لیکن اگر ہم صاف ذہن سے غور کریں اور غیر ضروری بحثوں میں نہ اُلجھیں تو تعلیم کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ ہے انسان کو انسان بنانا ۔انسان کو اگر تعلیم انسان (یعنی اچھا اور سچا انسان) نہ بنا سکے تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہے انسان سازی میں جو نظامِ تعلیم ناکام ہو اور متعلم میں انسانیت پیدا نہ کر سکے وہ ناقص اور لا حاصل ہے بلکہ ضرر رساں ہے قرآن حکیم کے نقطہ نظر سے وہ انسان بہترین انسان ہے جو اللہ کا اچھا بندہ ہو گویا قرآنی نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد عباد صالح اور نیک بندے تیار کرنا ہے ۔قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان بہترین امّت ہیں ۔اور ان کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ نیکیوں اور بھلائیوں کو پھیلائیں اور برائیوں کو روکیں ۔

فنِ شاعری

تدبیر وصل

آدم چغتائی

جس در سے ملتا ہے محبت کا اشارا
ہم کو بھی ذرا لے چلو اُس پار خدا را
اوہام کے بُت ہوں کہ ہوں پتھر کے خداوند
دیتے نہیں انساں کو اک پل کا سہارا
غافل کرے جو دیں سے وہ دولت نہیں اچھی
ہے ایسی تجارت میں خسارا ہی خسارا
کر نیک عمل وقت کی مہلت ہے بہت کم
آتا نہیں انساں زمانے میں دوبارا
اُس شخص کی کشتی کو بھلا خوف ہو کس کا
جس شخص کی کشتی کو ملے تیرا سہارا
مانگیں گے نہ ہرگز کسی نادار بشر سے
مانگیں گے تجھی سے اے میرے حاکم اعلیٰ
اک بوند بھی رحمت کی ملے وہ ہے غنیمت

تونے تو نگر بھر دیا گھر بار ہمارا
وہ صاحبِ لولاک جو عاشق ہے خدا کا
اُس نے سبق محبت کا دل میں اُتارا
روشن مری تنویرِ وفا دیکھ کے اُس نے
منسوب مری ذات سے کیا کیا نہ نوازا
جب تونے ہی الفت کی نظر پھیر لی ہم سے
پھر تو ہی بتا کیسے ہو آدم کا گزارا

مبارک صدیقی

محبت کے لئے رسوا سرِ بازار ہو جائے
وہی عاشق ہے جو وقفِ رضائے یار ہو جائے
یوں ہی چرچا نہیں اک شخص کے شاداب ہونے کا
اُسے تو دشت بھی دیکھے ▭ وگلزار ہو جائے
اُسے ملنے کبھی جاؤ تو عرضِ حال مشکل ہے
اگرچہ مل کے آؤ تو غزل تیار ہو جائے
اُنہیں شکوہ رہا ہم بات دل کی کہہ نہیں پائے
ہمیں دھڑکا رہا ایسا نہ ہو انکار ہو جائے
مبارک اور بڑھ جاتی ہیں اپنی عید کی خوشیاں
اگر اک چاند جیسے شخص کا دیدار ہو جائے

عامر امیر

دل کو اک آزار ہے کچھ کرنا پڑے گا
یہ عشق سے دوچار ہے کچھ کرنا پڑے گا
یہ حکم ہے بولوں وہی جو حکم ہو اسکا
یہ شاہ کا دربار کچھ کرنا پڑے گا
نہ عمر ہے، نہ وقت ، نہ ہی دنیا ہے موافق
اس کا بڑا اصرار ہے کچھ کرنا پڑے گا
بازار میں اخلاص نہ جذبات کی قیمت
اب حسن خریدار ہے کچھ کرنا پڑے گا
جمہوریت سے بڑھ کے انتقام نہیں ہے
تجویز یہ بیکار ہے کچھ کرنا پڑے گا

عاصی صحرائی

لکھ لالچ د یوو پیغمبراں نوں
نہیں گھِر دے اوہ گناہواں وچ
لکھ اولاد ماں توں نس جاوے
اک پیا ر دا دریا اے ماواں وِچ
غیرت جدوں جاگ دی اے
تلواراں کدوں رہندیاں نیاماں وِچ
شاہیں دا مقام ہے وکھرا سب توں
نہیں چُگدا اوہ چڑیاں کاواں وچ
ہیر دی لگن جس دل وچ ہووے
نہیں رہندا اوہ بھابیاں بھراواں وِچ
اپنی میں نوں مار کے رکھ
کجھ نہیں رکھیا انہاں اَناواں وچ
سب نال پیار دی جوت جگا
پیار وَنڈ دے بہن بھراواں وچ
اِکو سچے خدا ناں یاری لا

کیہ رکھیا انہاں جھوٹیاں خداواں وِچ

احمد فراز

میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا
قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا
تھا جنھیں زعم وہ دریا بھی مجھی میں ڈوبے
میں کہ صحرا نظر آتا تھا دریا نکلا
میں نے اس جانِ بہاراں کو بہت یاد کیا
جب کوئی پھول مری شاخ، ہنر پر نکلا
شہر والوں کی محبت کا میں قائل ہوں مگر
میں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا
تو یہیں ہار گیا مرے بزدل دشمن
مجھ سے تنہا کے مقابل ترا لشکر نکلا
میں کہ صحرائے محبت کا مسافر تھا فراز
ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا

ثاقب زیروی

رعنائیاں ہر سو بکھریں گی گیسوئے سحر لہرانے دو
پُرنور سویرا پھوٹے گا یہ ظلمت شب ڈھل جانے دو
تم اپنے وفا پہ دیوانو! بھولے سے بھی حرف نہ آنے دو
جو تم کو برائی دیتے ہیں تم اُن کو پیار خزانے دو
یہ سچے عشق کی باتیں ہیں خوش بختی کی معراج ہے یہ
وہ لطف مجسم جب بھی کہے جانوں کے بھی اب نذرانے دو
دل خوف خدا سے خالی ہیں ہوتی ہے تجارت مذہب کی
مذہب کے اجارہ داروں کو آئینہ ذرا دکھلانے دو
ہم جورو جفا کے خوگر ہیں بدلیں گے نہ اپنی خوئے وفا
ہم پیار کی شمعیں جلائیں گے نفرت کو زور لگانے دو
ناموس دیں کا تحفظ بھی اس دور میں اک خطا ٹھہری
یہ قاضی شہر کا فتویٰ ہے اس جرم کے ہر جانے دو

دوستی

دوستی ایک پاکیزہ رشتہ ہے۔اس کی لاج رکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی طوفان کو روکنا۔دوستی انسان کو غم کے اندھیروں سے نکال کر مسرت کی روشنی میں کھڑا کر دیتی ہے۔پھول کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔لیکن دوستی پھولوں سے بڑھ کر حسین ہوتی ہے۔پھول مُرجھا جاتے ہیں۔لیکن دوستی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔سچا دوست وہ ہے جس کی محبت بیش بہا اور جس کا خلوص بے مثال ہو۔

لطیفے

ماں:''بیٹا دل لگا کر پڑھا کرو''۔بچہ:''لیکن!ابو تو عینک لگا کر پڑھتے ہیں''۔

موٹا آدمی(دبلے آدمی سے)''تمہیں دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے دنیا میں قحط پڑ گیا ہو۔''

دُبلا آدمی:''اور تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ قحط تمہاری وجہ سے پڑا ہو''

استاد، بچوں سے: ''اچھا یہ بتاؤ دن میں تارے کیوں نہیں نکلتے''۔

ایک بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔''سر! وہ سورج کے راستے میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہتے۔''

فقیر:'' صاحب! میری مدد کیجئے۔ میرا سامان، بال بچے، مکان ،روپیہ پیسہ سب کچھ جل گئے ہیں۔''

صاحب:''اس کا ثبوت کیا ہے؟''۔فقیر:''جناب! ثبوت بھی تھا۔ مگر مکان کے ساتھ وہ بھی جل گیا''

کلاس میں لڑکوں کی شرارتوں سے تنگ آ کر استاد نے انہیں سیدھا لیٹ کر سائیکل کی طرح ٹانگیں چلانے کے لئے کہا۔ایک لڑکا تھوڑی دیر بعد رُک گیا۔استاد نے ڈانٹا تو اس نے کہا''سر میری چین اُتر گئی ہے''

ایک انگریز بڑھیا عورت ایک بچے کو جھولے میں ڈال کر لوری دے رہی تھی''سو جا میرے ڈپلومے''اس کی ہمسائی نے پوچھا کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے''ڈپلومہ'' بڑھیا بولی''اس کا نام ایسے ٹھیک ہے کہ میں نے اپنی لڑکی کو ڈپلومہ حاصل کرنے کیلئے کالج میں داخل کروایا تھا اور وہاں سے جو ڈپلومہ لے کر آئی ہے وہ یہی ہے''۔

ایک صاحب کسی مخولیئے کا تذکرہ کر رہے تھے اور مسکرا کر کہنے لگے۔وہ ظالم تو ایسی باتیں کرتا ہے کہ گدھے کو بھی ہنسی آجائے۔میرا تو ہنس ہنس کے بُرا حال ہو گیا تھا۔

ہیلو ارشد صاحب! میں میں شکیل بول رہا ہوں۔میں آج ڈیوٹی پر نہیں آسکتا کیونکہ کل رات سے مجھے مسلسل چھینکیں آرہی ہیں۔ کبھی کبھی گرج چمک کے ساتھ نزلہ گرنے کا امکان ہے۔نزلے کی وجہ سے ناک بند ہے۔اور سانس میں نمی کا تناسب پانچ فیصد ہے۔آج دن بھر میرا ٹمپریچر زیادہ سے زیادہ 42 اور کم سے کم 34 سینٹی گریڈ رہا۔ڈاکٹر نے گلابی رنگ کی دوائی تجویز کی ہے۔ انجیکشن بھی لگا دیا ہے مگر ری ایکشن ہونے کی پیشگوئی کی ہے۔آج کی رات مزاج خشک رہے گا اور کل صبح میری بیماری کا سورج 7.15 پر طلوع ہوگا لہذا مہربانی فرما کر میری چھٹی کی درخواست منظور کی جائے۔

ایک استاد نے شاگرد سے کہا''اسلم تمہارا مضمون سارا غلط ہے۔میں تمہاری شکایت تمہارے ابو سے لگاؤں گا۔شاگرد بولا جناب! یہ مضمون میرے ابو نے ہی لکھ کر دیا تھا۔

ڈاکٹر(مریض سے) لگتا ہے میرے علاج سے آپ کو خاصا فائدہ ہو رہا ہے۔مریض جل کر بولا مگر اتنا نہیں جتنا کہ آپ کو مجھ سے ہو رہا ہے۔

شوہر کو بے سُرا گاتے ہوئے سُن کر بیوی نے کہا''میرے ابا مرحوم جب گایا کرتے تھے تو اُڑتے ہوئے پرندے بھی گر جایا کرتے تھے۔شوہر بولا''کیوں! تمہارے ابا منہ میں کارتوس رکھ کر گایا کرتے تھے''۔

ایک بچے نے اپنے استاد سے کہا''میرے ابا کہہ رہے تھے کہ وہ ایک مرغی آپ کو تحفے میں دیں گے۔'' استاد یہ سُن کر خوش ہو گیا اور مرغی کا انتظار کرنے لگا ایک ہفتہ گزر گیا مرغی نہ آئی۔استاد نے پُوچھا ''بیٹا آپ کی مرغی نہیں آئی'' بچہ معصومیت سے بولا''وہ تو اب ٹھیک ہو گئی ہے''۔

لاٹھی۔ایک آدمی گھبرایا ہوا پولیس اسٹیشن پہنچا اور بولا۔مجھے گرفتار کر لیں میں نے اپنی بیوی کے سر پر لاٹھی ماری ہے۔پولیس افسر: کیا وہ مر گئی؟۔آدمی:نہیں۔وہ وہی لاٹھی لئے میرے پیچھے آرہی ہے۔

پالتو کتا!۔ایک بچہ گلی میں کھیل رہا تھا۔سامنے والے مکان سے ایک کتا نکلا اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔بچہ روتا ہوا گھر آیا۔ماں نے پوچھا رو کیوں رہے ہو۔کہیں پڑوسی کے کتے نے تو کاٹ تو نہیں لیا۔بچہ بولا ابھی تو چکھ کر گیا ہے کاٹنے تو کل آئے گا۔

بڑا افسر۔ایک حوالدار سپاہی سے: تم اتنا نشہ نہ کیا کرو۔اگر نشہ چھوڑ دو تو ایک دن میری طرح حوالدار بن جاؤ گے۔سپاہی: مگر جناب جب میں نشہ کرتا ہوں تو میں ڈی ایس پی سے بھی بڑا افسر بن جاتا ہوں۔

حضور ﷺ کا شگفتہ مزاح

۱۔اونٹ کا بچہ

ایک دفعہ ایک صحابیؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔اور سواری کے لئے اونٹ طلب کیا۔حضور ﷺ نے فرمایا''اسے اونٹ کا ایک بچہ دے دو''۔صحابیؓ نے عرض کیا حضور ﷺ میں اونٹ کے بچے کو لے کر کیا کروں گا؟''مجھے تو سواری کی ضرورت ہے اونٹ دلوایئے'' حضور ﷺ نے پھر فرمایا''نہیں تجھے اونٹ کا بچہ ہی دیا جائے گا'' وہ صحابیؓ بہت پریشان ہوئے۔لوگ ہنسنے لگے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا۔''نادان! آخر اونٹ بھی تو اونٹ کا بچہ ہی ہوگا'' ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کا یہ مذاق کوئی خلاف واقعہ نہ تھا کہ ہر اونٹ فی الحقیقت اونٹ ہی کا بچہ ہوتا ہے۔اس خوش طبعی کے لئے حضور ﷺ نے ایسا انداز اختیار فرمایا جس سے سب نے لطف اٹھایا۔

۲۔بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی

حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدا ✵ جو بہت بوڑھی تھیں۔ایک روز حضور ﷺ کی خدمت میں زچ کرنے لگیں کہ''حضور ﷺ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی مجھے جنت میں داخل فرمائے''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا''کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی۔''وہ حیران رہ گئیں اور رونے لگیں۔حضور ﷺ نے فرمایا''بڑی اماں روتی کیوں ہو؟ کیا قرآن نہیں پڑھا۔بوڑھے لوگ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں داخل نہ ہونگے بلکہ وہ جوان ہوکر جنت میں جائیں گے۔

۳۔تمہارے ماموں کی بہن تمہاری کیا لگی؟

ایک دفعہ رسول ﷺ نے دل لگی کے طور پر ایک شخص سے پوچھا ''بتاؤ تمہارے ماموں کی بہن تمہاری کیا لگی؟'' وہ شخص سادہ لوح واقع ہوا تھا، سر جھکا کر سوچنے لگا۔حضورر ﷺ مسکرائے۔اور آپ نے فرمایا۔ہوش کر کیا تجھے اپنی ماں بھول گئی؟ وہی تو تیرے ماموں کی بہن ہے''۔

۴۔اندھا جنت میں نہ جائے گا

ایک دفعہ ایک نابینا شخص حضرت رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا'یا رسول اللہ ﷺ! کیا میری بخشش ہو جائیگی؟

''حضور ﷺ نے فرمایا''بھائی کوئی اندھا جنت میں نہ جائے گا۔''اندھا رونے لگا۔حضور ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا:''بھائی کوئی اندھا، اندھے کی حیثیت سے جنت میں داخل نہ ہوگا سب کی آنکھیں روشن ہونگی۔''

۵۔اے دو کانوں والے

حضور ﷺ اپنے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بہت پیار کرتے تھے۔وہ ایسے سعادت مند تھے کہ حضور ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ایک دن حضور ﷺ نے خوش طبعی کے طور پر انہیں یوں پکارا:''اے دو کانوں والے'' پھر اکثر ایسا ہوتا کہ حضور ﷺ انہیں محبت سے''اے دو کانوں والے'' کہہ کر پکارتے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ اس پر بہت ہنستے اور سمجھ جاتے کہ حضور ﷺ خوش طبعی فرما رہے ہیں۔

۶۔تمہاری چڑیا نے کیا کیا؟۔حضور ﷺ کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ایک چھوٹے بھائی تھے۔جن کا نام عمیرؓ تھا انہوں نے ایک سرخ رنگ کی ایک چڑیا پال رکھی تھی۔اتفاق سے وہ چڑیا مرگئی۔تو عمیرؓ کو اس کا بہت رنج ہوا اور رونے لگے۔حضور ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا۔جب حضور ﷺ نے بچے کو روتے دیکھا تو اسے بہلانے کے لئے فرمایا ''اے ابوعمیرؓ تمہاری چڑیا نے کیا کیا'' یہ ایک ایسا پیارا جملہ تھا جسے سن کر بچہ ہنس پڑا اور دوسرے لوگ بھی اسے خوش کرنے کے لئے یہی جملہ استعمال کرنے لگے

۷۔زیادہ کھجوریں کس نے کھائی ہیں ؟ایک روز حضور ﷺ چند صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب کچھ کھجوریں لے آئے۔اور بطور تحفہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیں۔حضور ﷺ نے سبصحابہؓ کو کھجوریں کھانے کا حکم دیا اور خود بھی کھانے میں شریک ہوگئے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ جو عمر میں چھوٹے تھے۔آپ ﷺ کے پاس تشریف فرما تھے۔حضور ﷺ ازراہ مذاق کھجوریں کھ کر گٹھلیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آگے رکھنے لگے۔جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو وہ بھی کھجوریں کھا کر گٹھلیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آگے رکھنے لگے۔یہاں تک کہ ان کے سامنے بہت سی گٹھلیاں جمع ہوگئیں۔اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا ''آپ نے اتنی کھجوریں کھائی ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فورا کہا'' میں نے تو صرف کھجوریں کھائی ہیں۔آپ ﷺ تو گٹھلیاں بھی کھا گئے ہیں۔یہ سن کر حضور ﷺ مسکرادیئے۔

نیند (افسانہ)

امجد مرزا

اس کے لئے سکول جانا ایک عذاب تو تھا ہی مگر نیند سے آنکھیں کلیں تو جائے۔کبھی باپ اور کبھی ماں آکر جگاتی دوسرے بہن بھائی تیار بھی ہو جاتے تو اس کی آنکھوں کے غباروں میں جیسے پانی بھرا ہوا بوجھل بوجھل کھلتی ہی نہ تھیں۔آخر باپ آکر رضائی کھینچ پرے مارتا اور بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیتا۔اور وہ آنکھیں بند لئے کئی منٹ تک وہیں جھومتا رہتا۔پھر بڑا بیٹا ہونے کے ناطے گھریلو حالات نے اسعذاب سے جان چھڑادی۔اور نوکری لگ گیا۔مگر صبح جاگنا ایک قیامت تھی۔ماں پراٹھیاں بنا کر آواز دیتی رہتی۔بہن بھائی کب کے سکول جا چکے ہوتے۔فالج زدہ باپ اپنی چارپائی پر بیٹھا اپنی لاٹھی فرش پر مارتے، پکارتا رہتا۔اور اسے اپنا فرض یاد دلانے کے ساتھ اپنی مجبوریوں کو بیان کرتے رونے لگتا۔مگر نیند تھی کہ دماغ میں گھسی نہ نکلتی۔اتنے میں اس کا ماموں آجاتا۔جس کی دکان جا کر اسے کھولنی ہوتی۔وہ پڑوس میں رہنے کا پائدہ اٹھاتے گھر سے ہی ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر لاتا۔وہ چیخ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔جب ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر گولیوں کی طرح لگتے۔وہ سوچتا اے کاش ہاتھ میں بندوق ہوتی تو پہلے اس ماموں کو مارتا۔مگر وہ اپنی دوکان پر نوکری دینے کے احسان کی ڈھال لئے پانی کا سارا گلاس خالی کر جاتا اور اسے منہ دھونے کی ضرورت نہ پڑتی۔پھر قسمت اسے انگلینڈ لے آئی۔یہاں بھی الارم دوتین بار بجتا۔بازو کے کمرے سے سوئے ہوئے لوگ آکر جگاتے اور مذاق اڑاتے کہ اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے۔جس کی بارہ گھنٹے سوکر بھی نیند پوری نہیں ہوتی۔چھٹی والا روز یوں ہی گزر جاتا۔نہ بھوک لگتی نہ

پیاس۔ساتھ رہنے والے دوسرے روز جگاتے کہ آج دو بجے والی شفٹ پر جانا ہے۔پھر شادی ہوگئی، بچے ہو گئے۔مگر نیند ایسی کہ چھائی ہی رہی۔فائدہ یہ ہوا کہ اب اس کی بیوی سارا ناشتہ تیار کر کے بیڈ میں لے آتی،اور وہ وہیں سے کھا پی کر جمائیاں لیتا کام پر چلا جاتا۔مگر اب بھی چھٹی والا روز سونے میں گزر جاتا۔اور بیوی منہ بسورتی رہتی۔پھر بچے جوان ہو گئے۔تین بیٹیاں دو بیٹے۔وہ بوڑھا ہو گیا۔اور ریٹائرمنٹ لے کر بیٹھ گیا۔خوش تھا کہ اب جی بھر کر سوئے گا۔مگر اللہ جانے نیند کیوں روٹھ گئی۔جوان بیٹیاں آئے روز نت نئی سہیلیوں کے ہاں گئی ہوتیں ہیں۔اور سارا دن وہیں گزارتیں ایک بیٹے نے انگریز لڑکی کے ساتھ دوستی کر لی اور گھر چھوڑ دیا۔دوسرا اپنے کسی دوست کے ساتھ رہتا ہے۔لوگوں کا کیا وہ تو یوں ہی باتیں بناتے ہیں۔ویسے تو وہ اچھا خاصا مردوں کی طرح لگتا ہے اگر بیٹیوں کو سمجھانے لگو تو وہ اپنا سامان پیک کرنے لگتیں ہیں اور ان

کو رو رو کر منانے لگتی ہے۔پاکستان سے کئی بار بہن بھائی بیٹیوں کے رشتوں کے لئے خط لکھ چکے تھے۔مگر یہ مانیں تو۔بیوی خانستی رہتی ہے۔گولیں کھاتی رہتی ہے۔اوماران ہی کے نشے میں سوئی رہتی ہے۔مگر وہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔اور نیند دور کھڑی کہتی ہے۔مجھے جوانی میں بہت سو لیا۔اب بڑھاپے میں جاگ۔پھر ایک دن لمبی نیند سونا۔کوئی نہیں جگائے گا تمہیں۔وہ اکیلے میں مسکرا پڑتا ہے اور سوچتا ہے کاش یہ میرے بس میں ہوتا۔

تو ایسی نیند سوتا کہ پھر کبھی نہ جاگتا۔

اُردو کی رومانی شاعری

عاصی صحرائی

اردو شاعری کے موجودہ دور کو عہد رومان کہا جا سکتا ہے دور جدید کی شاعری اپنے تمام اختلافات کے ساتھ ایک مشترک روح رکھتی ہے۔جو روحانیت کے سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہے۔شاعری کیا ہے؟ یہ بھی زندگی کی مختلف کیفیتوں کی طرح ایک کیفیت ہے۔اور رومانیت ایک خاص انداز کی کیف زندگی ہے نفس کی مخصوص حالت کو رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔جس میں جذباتی کیفیات عقلی کیفیات سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔اور تخیل کے سمندر ناز کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے۔تخیل و جذبات کا بھر جانا رومانیت کی روح رواں ہے، رومانیت کی ایک اور اہم خصوصیت انفرادیت ہے۔مگر انفرادیت، رومانیت کا سبب نہیں، نتیجہ ہے۔رومانی تخیل کائنات کو ایک نئے طور پر دیکھتی ہے۔اور رومانی جذبات عالم کو ایک جدید رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔اور اس کا لازمی نتیجہ انفرادیت ہے۔رومانی شاعری زندگی کی تعمیر نو ہے۔یہ روح کا ارمان بہشت آفریں ہے انسانی دل کی ازلی تشنگی کی بے قراریاں اس کی رگ جاں میں پھڑکتی نظر آتی ہیں۔رومانیت برنائی حیات کا خواب بیداری کرتا ہے۔اور روح کا اُفق وسیع تر ہوتے ہوتے لامحدود ہو جاتا ہے اور اس افق بے کراں کی آغوش میں آفتاب ہائے تازہ انوار فشاں ہوتے ہیں۔رومانی شاعر جب مناظر فطرت اور مظاہر حیات سے لطف اندوز ہوتا ہے تو وہ لطف اندوزی باطنی ہوتی ہے۔اس وقت حسن وصداقت ہم آغوش نظر آتے ہیں۔موجودہ رومانی شاعری نفسیاتی اثر کے ماتحت ظہور پذیر ہوئی ہے۔یہ تجدید ہے اردو شاعری کی رومانیت اولیں کی۔جس طرح انگریزی شاعری میں ایک شیکسپیئر کا رومانی دور تھا اور دوسرا ،ورڈورتھ کا اور شیلے کا۔اسی طرح اردو شاعری کا پہلا رومانی دور کا ہیرو مرزا تھا اور دوسرا رومانی دور عہد حاضر ہے۔رومانیت کے عروج ہی کے زمانے میں یعنی غالب و مومن کے دور میں

''کلاسیت'' نے جڑ پکڑ لی تھی۔ حالات کا اختلاف یا بزبان دیگر ماحول کا اختلاف دونوں رومانی ادوار میں مابہ الامتیاز ہے جو ذہنی، اقتصادی، سیاسی حالات آج موجود ہیں وہ اس وقت نہ تھے۔ لیکن نفسیاتی نقطہءنظر سے دونوں یکساں ہیں۔ کیونکہ دونوں پر جذبات و تخیل کی حکومت ہے۔ قبل اس کے کہ میں موجودہ رومانی شاعری کی تخلیق و تاسیس اور ارتقاء و عروج پر نظر ڈالوں۔ نفسی حیثیت سے ادب میں انقلابات کی وجوہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ادب حیات کا ''نبض پیما'' ہے۔ زندگی کو اگر آپ ایجاز بلیغ کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہوں تو ادب کو دیکھیئے۔ عروس حیات آئینہ ادب میں اپنی صورت دیکھتی ہے پہلے نفس میں انقلاب آتا ہے پھر اس کا اثر زندگی کی مختلف کیفیتوں میں واضح نظر آتا ہے پھر ادب میں بہت گہرا نظر آئیگا۔ اب آیئے حقیقت انقلاب کا تجزیہ کیا جائے۔ انسان کی روح بھی اس کے جسم کی طرح یہ مختلف ''اجزا'' بھی لطیف، غیر مرئی اور غیر مادی ہوتے ہیں۔ جب جسم میں کسی عنصر کی کمی ہو جاتی ہے۔ تو اس کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ آپ اگر میٹھا کھاتے رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ نمک کی طرف آپ کو نا قابل برداشت رغبت ہوگی۔ حیوانی دنیا میں بھی امر مذکور کا مشاہدہ ہوتا ہے ہرنوں کا ریوڑ اچانک امریکہ کے جنگلوں کے شاداب سبزہ زاروں کو چھوڑ کر سوکھی ہوئی جھیلوں کی طرف دیوانہ وار دوڑ جاتا ہے تا کہ وہاں جا کر نمک چشمی کرے جب نمک کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو سارا گلہ چراگاہوں کی طرف واپس آجاتا ہے۔ سیاسی، و معاشی، مذہبی و معاشی انقلابوں کی بنیاد بھی نفس ہی میں پڑتی ہے۔ انسانی روح کے اجزائے تعمیری کی کمی و بیشی نفسی انقلاب کا سبب اولین ہوتی ہے۔ اگر انسانی نفس کو صرف عقلی غذائیں ملتی رہیں تو ایک وقت وہ جذبات سے سیراب ہو جاتا ہے تو نفس عقل کی بھوک محسوس کرتا ہے۔ اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل۔۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ موجودہ رومانی رجحان مظہر کا ہے اسی نفسی انقلاب کا جو معاشرہ کی روح میں آیا اور یوں تو ظاہراً ردِ عمل ہے۔ لکھنؤ اسکول کی ''کلاسی'' classical شاعری کیخلاف مگر باطناً خود کلاسی شاعری مظہر تھی اس دور کی نفسی حالت کی۔ معاشرہ کا ''نفس اجتماعی'' Collective Soul ادب کے ذریعے ظہور کرتا ہے۔ اب آیئے سرِ راہے، ذرا ''کلاسیت'' Classism اور اردو کی کلاسی شاعری کا جائزہ لیا جائے۔

لکھنؤ کی کلاسیکل شاعری۔ دہلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ کا عروج ہوا اور آرزوئے جدت میں لکھنؤ اسکول کی بنیاد پڑی۔ یوں تو نصیر دہلوی نے بھی خالص کلاسی شاعری کے نمونے پیش کئے مگر اس صنف کو ناسخ اور اس کے پیروؤں نے تکمیل کے ساتھ برتا۔ لکھنؤ نے دلی سے الگ ہو کر ایک الگ ہو کر ایک جدید تہذیب کی ابتدا کی مگر اس جدت میں زندگی نہیں تھی۔ ہندوستان کے اردو نواز طبقہ پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا ہر سُو پسپائی تھی۔ اور ہر جانب موت لکھنؤ کی نئی تہذیب حیات سے ہمکنار نہ تھی بلکہ وہ ایک سوانگ تھی زندگی کا۔ صرف ادب و شعر ہی میں نہیں۔ بلکہ تہذیب کے ہر شعبے میں لکھنؤ پر ایران کی کلاسیت کا اثر پڑا جس طرح پوپ اور ڈرائیڈن کے زمانے میں لاطینی کلاسیت کا انگریزی ادب و تمدن پر اثر پڑا تھا۔ کلاسیت کی خصوصیات یہ ہیں کہ نفس شعر سے زیادہ قواعد و ضوابط کی پابندی الفاظ کی تراش و خراش، آرائش و زیبائش اور صناع و بدائع پر زور دیا جاتا ہے ایسی شاعری کی مثال حنوط شدہ لاشوں کی سی ہے۔ خارجی شوخی و طرحداری پر تو کافی وقت صرف کیا جاتا ہے مگر روح کا فقدان ہوتا ہے۔ کلاسی شاعری میں انفرادیت کا فقدان

تھا۔ کیونکہ انفرادیت نتیجہ ہے زندگی کا۔ اور کلاسی شاعری ایک دم توڑتی ہوئی تہذیب کی زبان تھی۔ دبستان لکھنو نام ہے بیچارگی کی تقلید کا۔ بیمار جذبات کا۔ مدفون تخیل کا! کلاسیت کی خوبی ہے کہ اس دبستان میں بے راہ روی خودسری وجنون پسندی نہیں، جذبات کی باگ ڈور کامل طور پر عقل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کلاسیت ناکاروں کے ہاتھوں میں فرسودگی اور موت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر کارواں شخصیتوں کے قبضے میں آکر تناسب فن کی بہترین مظہر ہوتی ہے۔ اردو کی خوش بختی سے لکھنو میں ایک نابغہ "Genius" پیدا ہوا جس نے کلاسیت اور رومانیت کو ہم دست کر دیا نابغہ قواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ قواعد کو پابند کر لیتا ہے۔ وہ کسی دبستان کا پیرو نہیں بلکہ دبستان اس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ ماحول سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے مگر ماحول پر بھی اپنی خاتمیت کی مہر لگا جاتا ہے۔ نابغہ اپنے زمانے کا فرزند تو ہوتا ہے مگر آنے والے زمانے کا باپ بھی ۔انیس کلاسیت کے تقلیدی دور میں رہ کر بھی کلاسیت سے بلند تھا۔ اس کی شاعری میں ہمیں کلاسیت اور رومانیت کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اور ان کی برائیاں وہاں ناپید ہیں۔ انیس کا آرٹ یونان کے مشاہیر ادب وشعر کے فن سے مشابہ ہے۔ اس استثناء کے علاوہ دور کلاسیت کی شاعری ایک فرسودہ، مضمحل، بیمار بے جان اور غیر فطری شاعری تھی۔ جس طرح ناامیدی کے قلب میں امید کی چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح کلاسیت کی تاریکیوں میں افق بہار پر ایک تابندہ ستارہ صبح طلوع ہوا۔ ہر چند کہ شاد کلاسی سکول کی پیداوار تھے۔ مگر ان کی شاعری میر اور مومن کی یاد دلاتی ہے۔ یہ تھی

رومانیت کی صبح صادق۔ اس کے بعد رومانیت کے شفق زاروں میں نظیر اکبر آبادی اور حالی نے لالہ کاریاں کیں۔ اردو شاعری سے نظیر کا وہی تعلق ہے جو Burns کا انگریزی شاعری سے ہے ۔دونوں نے رومان کی بانسریاں بجائیں مقامی لے کے ساتھ۔ مگر ان کے نغمے بلا کے دلفریب تھے۔ کسی پرستان سے آنے والے گیتوں کی طرح ۔ اور حالی کی مثال ورڈزورتھ Wordsworth اور Coleridge سے دی جا سکتی ہے ۔حالی کا مقدمہ شعرو شاعری" لیریکل بیلارڈز (Lyrical Ballards) کے دیباچہ (Preface) کی طرح ہے۔ دونوں دیباچوں نے اپنی اپنی شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ غرض نظیر، حالی، اور شاد رومانی شاعر کے علم بردارانِ اولین ہیں۔

اُردو میں رُومانی شاعری کا دوسرا دور

اب میں رومانی شاعری کے پس منظر اور ماحول اور ان تحریکات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ جنہوں نے اس پر اثر ڈالا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سارے ہندوستانی معاشرے میں ایک متشائم اثر تھا ایک اعلیٰ تمدن کی سربفلک عمارت کے کھنڈروں کی اینٹیں بٹ رہی تھیں جس نے اپنے مٹنے کا سامان خود کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں لوگوں نے اپنی قبریں کھودی تھیں۔ اب غیر ان کی لاشیں دفن کر رہے تھے۔ ان بدبختوں کو تو اپنی تباہی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن نوزائیدہ نسل جو اگرچہ آدم کے گناہ کی وارث تھی اپنے دل میں ایک بے اطمینانی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ فردوسِ گم شدہ میں اس سے تو خطائیں سرزد نہیں ہوئی تھیں۔ وہ کیوں سزائیں بھگتے۔ بیٹا اپنے باپ سے مختلف ہوتا ہے اور مشابہ بھی۔ جدید نسل کی روح نیم معصوم ضرور تھی لہٰذا یہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن نہ تھی۔ اسے جنت کی بازیافت کی آرزو ستانے لگی تھی۔ لوگ چاہتے تھے کہ حالات بدلیں یہی حالت تھی کہ مغربی تہذیب کے اقدام نے معاشرہ کو اور حکومت کے چراغ چونکا دیا۔ مغربی تعلیم وتہذیب اور معاشرت کا اثر ہوا۔ حکومت کے چراغ

کاشانہء اغیار میں جلتے نظر آئے عیسائی مشنریوں کی تگ و دو نے آرام سے سوئے عقائد تک کو جھنجوڑ کر تحت الشعور کے گوشہء عافیت سے جگایا۔ یہ بے اطمینانی کا دور تھا جو اپنا دامن ہمارے زمانے تک وسیع کئے ہوئے ہے اور یہی رومانیت کا بیج ہے۔ رومانت نام ہے روزمرہ کی بے کیفی سے اجتناب کا۔ عین اس وقت دو تحریکیں سامنے آئیں ایک علی گڑھ کی تحریک اور دوسری پنجاب کی۔ علی گڑھ کی تحریک یہ تھی کہ فرسودگی کے خیال کو معاشرے سے منع کرنا چاہیئے اور جدید بنیادوں پر تہذیب کی عمارت اٹھانی چاہیئے۔ اس تحریک سعید کا یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ سماج میں ایک روشن خیال طبقہ پیدا ہو گیا جو نئی تعلیم سے آراستہ تھا۔ دوسری تحریک کا مرکز پنجاب تھا۔ اس تحریک کی کوشش یہ تھی کہ لوگ پھر حجاز کی طرف رُخ کریں۔ پھر وہی اگلے ولولے پیدا ہوں پھر وہی سادگی اور روح کی بیداری۔ اس تحریک کی بنیاد جذبات پر تھی۔ اور یہ عقل کے میدان میں بھی جذبات سے گل بوٹے اُگانا چاہتی تھی۔ لازماً دوسری تحریک کا اثر پنجاب کی رومانی شاعری پر پڑا۔ موجودہ بے کیفی سے انحراف اور ایک نئی دنیا کی تعمیر، یہ تھی بنیاد رومانی شاعری کی۔ زندہ دلانِ پنجاب نے اس بے کیفی کا علاج ماضی میں تلاش کیا۔ اور نئی تہذیب کا نمونہ تہذیب حجاز کے پُرشکوہ آثار میں ڈھونڈا اس گروہ کے سالارِ کارواں علامہ اقبال ہیں۔ پہلی تحریک کا اثر صوبہ متحدہ میں ہوا۔ اس گروہ کے علمبردار جوش ملیح آبادی ہیں۔ ان کی رومانیت ایک نئی دنیا کی تعمیر چاہتی ہے۔ یہ انقلاب کے رجز خواں ہیں۔ اس جماعت پر یورپ کی جدت نے اپنا اثر ڈالا۔ یہ مغرب پر مغرب کے ہی جدید ہتھیاروں سے ہی فتح پانی چاہتے ہیں۔ اور اولالذکر عربی نیزوں پر بھروسہ رکھتا ہے ایک مستقبل کو ماضی کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔ اور دوسرا مستقبل کو مستقبل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔ جس طرح بائرن اور کیٹس تہذیب یونان کے شیدائی تھے اسی طرح اقبال تہذیب حجاز کے گرویدہ ہیں۔ اور جوش انقلاب کا قرنا پھونکتے ہیں۔ انقلاب فرانس نے انگریزی رومانی شاعری کو متاثر کیا تھا۔ اور انقلاب روس نے اردو کی رومانی شاعری پر اثر ڈالا۔ ہندوستان میں جنگ عظیم اول سے پہلے ہی تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔ حریت کی رگوں میں خون دوڑنے لگا تھا کہ جنگ عظیم اول کی قیامت برپا ہوئی اور اس کے اختتام پر روس کی زاریت تباہ ہو گئی اور کتنے شہنشاہوں کی کج کلاہیاں خاک میں مل گئیں۔ جنگ کے بعد ہندوستان میں ترک موالات کی تحریک کا عروج ہوا اور پھر پے در پے قانون عظمیٰ اور عدم ادائیگی محصولات کی مہمات شروع ہوئیں۔ دوسرے ممالک میں بھی انقلاب پر انقلاب شروع ہو رہے تھے۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ معاشرے میں ذہنی انقلاب بھی ہو رہا ہے۔ پرانے نظریے بدل رہے تھے۔ ماضی کے قوانین پر نکتہ چینیاں زوروں سے شروع ہو گئیں تھیں۔ فلسفہ اخلاق پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اور ''نسائیات'' کے متعلق لوگ زیادہ فطری طور پر غور کرنے لگے تھے۔ داعیاتِ شباب اور جنسیات ہر چند کہ پرانے طرز کے لوگوں میں قطعی مردود تھے۔ مگر ایک طبقہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا تھا جو فطرت کی پکار پر کان بند کر لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ ''مغنیوں'' اور ''سبزہ آغاز'' برہمن زادوں کی جگہ اب ''سلمیٰ'' اور ''عذرا'' لینے لگی تھیں۔ اس دور میں ہماری موجودہ رومانی شاعری پرورش پاتی رہی ہے اور اب تک پرورش پا رہی ہے۔ ابھی ہمارے ماضی قریب اور حال میں چنداں تفاوت پیدا نہیں ہوا۔ ''حجازیت'' اور ''انقلابیت'' کے بڑے دو دھاروں کے علاوہ ''رومانیت'' کی اور صورتیں بھی ہیں جن میں ''وطنیت'' اور حسن پسندی کو امتیاز حاصل ہے۔ ''وطنیت'' نے چکبست کو ترجمان بنایا اور ''

زلیخائے رومان'' نے اختر شیرانی کو اپنا ''یوسف'' بنانے کے لئے چن لیا۔ اگر چہ چکبست وارجن، کرشن ورام کے قصیدہ خواں ہیں تو اختر سلمٰی کے حسن صبیح کی یاد میں نغمہ سنج ہیں۔ اقبال، جوش اور چکبست تینوں دور زریں Millenium کے خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال کے خواب کی تعبیر حجاز میں ہے جوش کی انقلاب میں اور چکبست کی ہند قدیم میں۔ یہ تینوں فرسودہ دنیا کو بدل کر ایک نیا عالم رنگ و بو تخلیق کرنا اور حالات کا مقابلہ کر کے اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں ان کی شاعری پیغام عمل ہے ان تینوں کی رومانیت میں عملیت ہے۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

عامر امیر

مجھے نفرت ہے عدم مساوات، ظلم اور ناانصافی کی تند و تیز آندھیوں کے خلاف محبت، برابری، حق اور انصاف کے چراغ جلانے میں۔ ہر چند کہ گھُپ اندھیرے میں ایک جگنو کی روشنی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور نہ سنگلاخ چٹانوں پر شبنم کے برسنے سے پھول اُگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی انسان کے بس میں جو کچھ ہے جو وہ کر سکتا ہے۔ نتائج کا انتظار کئے بغیر اگر وہ پوری جدو جہد اور تسلسل کے ساتھ کرتا چلا جائے تو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے کا صرف محاورہ ہی نہیں آتا بلکہ سچ مچ جوئے شیر بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بظاہر گلہری اپنے جسم سے لپیٹ کر رات کے جو چند ذرے دریا کی بپھری ہوئی موجوں کے خلاف بچھاتی ہے اس سے طوفان کے سامنے نہ دیوار کھڑی ہوتی ہے اور نہ بند باندھا جا سکتا ہے۔ مگر اصل بات وہ ''احساس'' ہے جو ظالم موجوں کو روکنے کے لئے حق کی حمایت کی خاطر اسے میدان کارزار میں اپنی بساط کے مطابق کوشش اور سعی کرنے پر اُکساتا ہے۔ یہی احساس'' وہ روشنی ہے جس کی چمک خواہ کتنی ہی مدّم اور کم کیوں نہ ہو بہر حال ایک دن وہ ظلمت کی شب کا دامن تار تار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب یہ احساس پختہ ہو کر ''یقین'' کے نور سے منور ہو جائے۔ تو پھر ظلم اور نا انصافی کے تاریک سائے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتے ہیں۔ محبت ایک سچائی ہے ایک نہ تھکنے اور نہ اکتانے والے مسلسل عمل کا نام ہے۔ یہ بات نہ صرف عام اور سطحی طور پر ہمارے معاشرے میں عروج مادی محبت کے بارے میں صادق آتی ہے۔ بلکہ کسی بھی اعلیٰ مقصد میں کامیابی اور کامرانی کے لئے بھی یہی لگن، جذبے کی سچائی، محبت اور مسلسل جدو جہد ہے۔ محبت اس دنیا میں سب سے زیادہ اور عام ملنے والا خام مال ہے۔ مگر افسوس دنیا کے اکثر ٹکسال حقیقی محبت کی بجائے خواہشات کے صرف کھوٹے سکے بناتے ہیں اور یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ کہ ہم نے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اور اس مجازی محبت کے نتیجہ میں محبت کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ چند لمحے سکون کے ساتھ بیٹھ کر یہ سوچ سکے، تدبر کر سکے، غور کر سکے، کہنے کی حد تک تو کہا گیا کہ غمِ محبت اور راحتِ وصل کے علاوہ بھی بہت کچھ زمانے میں ہے۔ مگر عملی طور پر اس سلسلہ میں بہت کم توجہ دی گئی۔ محبت کی سچائی کو اگر یقین کی ''روشنی'' حاصل ہو جائے تو یہ انسانی ذہن، وجدان اور شعور کو اس طرح منور کر دیتا ہے کہ یہ ''روشنی'' اس کے لئے نشانِ منزل اور مینارِ نور کا کام دیتی ہے۔ اکثر انسانی ضمیر روشنی کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ انسانی ضمیر بہت بڑا منصف ہے۔ بڑے بڑے پیچیدہ مسائل فوراً حل کر دیتا ہے۔ اور ان کا فیصلہ غلط بھی نہیں ہوتا۔ مگر انسانی ضمیر کا یہ پودا بہت نازک مزاج ہوتا ہے۔ ''احساس'' کا پانی اور عدل کی کھاد جہاں کم ہوئی یہ سوکھ کر مردہ ہو جاتا ہے۔ اور

یہ حالت لا علاج ہے۔ مردہ ضمیر کے لئے کوئی مصنوعی علاج یا آکسیجن کا کوئی مصنوعی تنفس کام نہیں دیتا۔اس لئے اس کی حفاظت بہت ضروری ہے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر ضمیر کا فیصلہ سننا بڑے دل گردے کا کام ہے۔لیکن جو اس امتحان میں کامیاب ہوا، کندن بن گیا۔انسانی معاشرے کی بنیاد عدل اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ انصاف اور عدل کے بغیر مساوات کا تصور ناممکن ہے ۔قانون اور انصاف کے لئے دوہرا معیار قائم کرنا سب سے بڑی بے انصافی ہے۔ دوہرا معیار اصل میں انصاف کی نفی ہے۔ عدل کے بغیر کوئی معاشرہ زیادہ دیر تک پرامن نہیں رہ سکتا۔قانون وہی ہے۔

جو روح اور حقیقت کے لحاظ سے مساوات اور عدل قائم کرے ۔قانون پر صحیح روح کے ساتھ عمل کرنا اصل بات ہے۔انسانی تمدن میں مذاہب کا کردار اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔کہ مذہب اصول اور ضابطے مقرر کرتا ہے۔اور اس کی اصل روح کے ساتھ اس پر عمل کی ترغیب دیتا ہے۔مذہب قانون بنا کر حدود متعین کرتا ہے وہ انسانی ذہن اور خواہشات کو منتشر ہونے سے بچاتا ہے۔اور ایک مرکزی نقطے کے طابع رکھتا ہے۔تاریخ مذاہب اس بات کی گواہ ہے کہ مذاہب نے محبت اور سچائی کو اپنے منشور کی اساس کے طور پر پیش کیا۔مذہب نام ہے آفاقی قدروں کا، یہ نام ہے محبت کا، سچائی کا، بھائی چارے اور اخوت کا، باہمی احترام کا اور اگر کسی جگہ یہ اکائیاں موجود نہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا۔کہ بعد میں اس مذہب کی تشریح اور تعبیر کرنے والوں نے ٹھوکر کھائی اور وہ اصل روح سے دور چلے گئے۔عدل اور انصاف کی حفاظت کے لئے احتساب بہت ضروری ہے۔ احتساب اور جوابدہی کا عمل انسان کو بے لگام ہونے سے بچاتا ہے۔عدم احتساب جنگل کے قانون کو جنم دیتا ہے یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔معاشرے میں عدل اور امن رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جذبہء ایثار کو فروغ دیا جائے۔قربانی کے جذبہ کو رواج دینے کی ضرورت ہے۔مال کی قربانی، عزت کی قربانی، جان کی، وقت کی قربانی، جو قربانی کا فن نہیں جانتا، جو مرنے کے سلیقہ سے ناواقف ہے، جو اس فن سے محروم ہے، زندگی اسے زندہ رہنے کے فن سے محروم کر دیا کرتی ہے۔زندگی کا آبِ حیات موت کے پیالے سے قطرہ قطرہ کشید ہوکر ملتا ہے۔جو اس زہر کو سقراطی وجدان سے پی گیا وہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔دنیا کی کوئی طاقت اسکے وجود کو کالعدم نہیں کر سکتی۔قانون اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو جس چیز نے زیادہ نقصان پہنچایا وہ ہے” SHORT CUT“ یعنی قانون سے ہٹ کر، مروجہ طریقِ کار سے ہٹ کر۔جلدی سے، فوراً ہی کسی چیز کا حصول، انسانی جبلت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ پابندیوں کو توڑنے کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں سے پہلے ٹکٹ لینے پر طبیعت مچلتی ہے۔یہ خطرناک رُجحان ہے۔یورپی اقوام اس لحاظ سے آگے ہیں کہ ان لوگوں میں برداشت ہے اپنی باری کا انتظار کرنے کی ہمت ہے۔اور وقت ہے قانون سے عموماً ہمارے ہاں ایک قسم کی لاپرواہی برتی جاتی ہے۔اور ہم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں، کہیں ایک فرد قانون توڑتا ہے یا قومی چیز کو نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے۔تو اس کے قریب کھڑے ہوئے درجن بھر افراد کھڑے تماشا بنے رہیں گے۔اسے اخلاقی جرات کا فقدان کہا جا سکتا ہے۔اگر ہمت کر کے ایک آدھ فرد غیر قانونی بات پر احتجاج کرے تو اس خرابی سے کسی حد تک نجات پائی جا سکتی ہے۔مسلسل محنت، سچائی اور نیک نیتی سے عمل کیا جائے تو اس کے ثمرات بہت جلد ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔مسلسل محنت کرنا وہ سنہری کنجی

ہے جس سے بڑی بڑی مشکل تجوریوں کے تالے کھُل جاتے ہیں۔محبت سے بھرپور مسکراہٹ ایک ایسا پھول ہے جسکی خوشبو کبھی کم نہیں ہوتی ۔یہ وہ ہتھیار ہے جس کی قسمت میں فتح ہی فتح ہے۔ناکامی اور نامرادی اس کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ پاتیں۔اس لئے محبت کو فاتح عالم کا نام دیا گیا ہے۔اگر آپ محبت کی خوشبو سے معطر ہو کر مسلسل کوشش اور یقینِ کامل کی فولادی وردی خود پہن کر کارِزار میں نکلیں گے تو مشکلات کا دیو سرنگوں ہو کر آپ کے قدموں میں رحم کی بھیک مانگتا نظر آئے گا۔کامیابیاں اور کامرانیاں آپ کے سر کا تاج بنیں گی ۔اس کے ضروری ہے سب سے پہلے منزل کا واضح تعین کریں منزل کے حصول پر مکمل یقین ہونا ضروری ہے۔اور پھر جذبے کی سچائی کے ساتھ جو بھی انسان کے بس میں ہو وہ کرتا چلا

جائے۔یقین بہت بڑی قوت ہے یقین کی دولت جسے مل گئی وہ غنی ہو گیا یقین سے دریاؤں کا رُخ موڑا جا سکتا ہے پہاڑ کاٹے جا سکتے ہیں یقین سے انہونی کو ہونی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یقین وہی کچھ دے گا جس قدر تیقن اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اسکا تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے گا۔جس کو یقین جیسی دولت حاصل ہو گئی وہ مفلسی سے بچا لیا گیا۔

{مزاحیہ شاعری}

خوشا مد

خوشا مد بڑے کام کی چیز ہے
زمانے میں آرام کی چیز ہے
خوشا مد پہ کچھ خرچ آتا نہیں
خوشا مد کے سودے میں گھاٹا نہیں
خوشا مد سے اکثر منسٹر بنے
خوشا مد سے کئی منزلہ گھر بنے
خوشا مد کنندہ نہ فاقوں مرے
مزے اس کی اولاد ، پشتوں کرے
ضروری نہیں ہو وہ لکھا بڑھا
خوشا مد کے چھ حرف ہو جانتا
خوشا مد سے سرکار والے بھی خوش
خوشا مد سے اخبار والے بھی خوش
خوشا مد سے بے کار بھی کاردار
خوشا مد کنندہ ہے دربار دار
خوشا مد سے یخ بستہ دل گرم ہوں
خوشا مد سے پتھر صنم نرم ہوں
جہاں جھانک سکتا نہ ہو آفتاب
خوشامد کنند وہاں باریاب
زمیں پر محیط آسماں پر محیط خوشا
مد ہے سارے جہاں پر محیط
خوشا مد زمانے کی وہ فیلسوف
بنائے جو ذی عقل کو بے وقوف
درآمد کرو یا برآمد کرو
چلے بس جہاں تک خوشا مد کرو
خوشا مد عجب نیک اسلوب ہے
خوشامد خدا کو بھی مرغوب ہے

پیدا کرو

شوق سے لختِ جگر، نورِنظر پیدا کرو

ظالمو! تھوڑی سی بجلی بھی مگر پیدا کرو
ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ اخلاق کی بجائے
توپ کے دھڑ، بم کے سر، راکٹ کے پرَ پیدا کرو
شیخ، ناصح، محتسب، مُلا کس کی سنیں؟
یارو کوئی ایک مرد معتبر پیدا کرو
میں بتاتا ہوں زوالِ اہل یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو
میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر پیدا کرو اور مختصر پیدا کرو
تیرے شعر کو یہ اولادِ آدم کیا کرے
خدمت اسلام ہو چکی اب دہشت گرد پیدا کرو
حضرتِ اقبال کا شاہیں تو ہم سے اُڑ چکا
اب کوئی مقامی جانور پیدا کرو

بیویاں

سسرال میں جو میکے سے آتی ہیں بیویاں
سو سو طرح سے دھوم مچاتی ہیں بیویاں
کھانے مزے مزے کی کھلاتی ہیں بیویاں
جینے کا جو مزا ہے چکھاتی ہیں بیویاں
کچھ دن تو خوب عیش کراتی ہیں بیویاں
پھر اس کے بعد خون رُلاتی ہیں بیویاں
چھوڑے کسی نے بال ہیں بیوی کے واسطے
کچھ جمع کرتے مال ہیں بیوی کے واسطے
اتنے جتن سے گھر میں آتی ہیں بیویاں
چودہ طبق میاں کو دکھاتی ہیں بیویاں
کچھ تو نہال ہیں بیگم کے ہاتھ سے
پاتے ہر ایک مال ہیں بیگم کے ہاتھ سے
کچھ مست جذب و حال ہیں بیگم کے ہاتھ سے
آخر میں سب حلال ہیں بیگم کے ہاتھ سے
بچوں کے پہلے چوکے اُڑاتی ہیں بیویاں
انصاف سے جو نہ چلو تم رات دن
پھر نائن نائن نائن ملاتی ہیں بیویاں
پھر شوہروں کے چھکے چھڑاتی ہیں بیویاں

گہرنایاب
اے۔آر۔راجپوت

☆اپنے رب کے سوا کسی سے امید نہ رکھو۔☆لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو۔☆بے موقع بات بعض اوقات انسان

کو لے ڈوبتی ہے۔☆ تنہائی بُرے ساتھی سے بہتر ہے۔☆ کامیابی یقین محکم سے ملتی ہے۔☆ خوبصورتی ختم ہوجاتی ہے مگر خوب سیرتی ہمیشہ دیر تک یاد رکھی جاتی ہے۔☆ جو راہ کی سختیاں برداشت کرنے کا اہل ہے وہی پتھر ہیرے کا درجہ اختیار کرسکتا ہے☆ دو دفعہ پوچھنا غلط راہ اختیار کرنے سے بہتر ہے☆ زندگی صرف چند دنوں کے لئے ہے اور اچھا نام ابد تک رہتا ہے۔☆ دوست وہی اچھا جو برائی سے روکے۔☆ مہمانوں پر خرچ کرنا اسراف نہیں ہوتا۔☆ کسی پر احسان کرو تو اسے چھپاؤ اگر کوئی تم پر کوئی احسان کرے تو اسے ظاہر کرو☆ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت ہی برستی ہے☆ دوسروں کی مدد پر مت جیو اپنی مدد آپ کرو۔☆ **۔انسان۔** انسان عجیب مخلوق ہے۔خود تماشا اور خود ہی تماشائی ہے۔خود ہی میلہ لگاتا ہے اور خود ہی میلہ دیکھنے نکلتا ہے۔ہجوم میں ہر انسان اس ہجوم کا حصہ ہے۔ہر انسان اپنے علاوہ انسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔تنہائیاں اکھٹی ہوجائیں تو میلے بن جاتے ہیں۔ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں☆ **۔دیوار۔۔** بیوی نے شوہر کی کسی بات پر ناراض ہو کر کہا ''اگر میں تمہارے راستے کی دیوار ہوں تو تم اُسے گرا کیوں نہیں دیتے''۔شوہر سر کھجاتے ہوئے بولا ''جی تو بہت چاہتا ہے مگر دوسری دیوار بنانے میں بڑا خرچ آئے گا۔بس یہ سوچ کر رُک جاتا ہوں''☆ **۔زندگی۔** زندگی ایک تماشا ہے۔جو کسی کو کرنا اور کسی کو دیکھنا پڑتا ہے۔کوئی خوش ہے اور کوئی اداس،مگر کوئی بھی اپنی خواہشات سے دستبرداری اختیار کرنے کو تیار نہیں اور جو اپنی ایک خواہش پوری کر لیتا ہے اور دوسری کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور یہ سلسلہ خواہشات اس کی موت تک جاری رہتا ہے۔زندگی ایک ایسا بزنس ہے جس میں نقصان بھی فائدہ اٹھانے والے ہی کو ہوتا ہے ۔مگر وہ اس نقصان کو سمجھ نہیں پاتا۔اور اس میں کسی حد تک اس کا قصور بھی نہیں ہے۔کیونکہ وہ اپنے فائدے میں اپنے ساتھ ہونے والے خسارے کو فراموش کر دیتا ہے۔اسے اس بات کا اندازہ تب ہوتا ہے جب وہ فائدہ اٹھا چکا،خوشیاں سمیٹ چکا،اور زندگی جی چک ہوتا ہے ۔ہر شخص اس دنیا میں بہت ساری آرزوئیں اور تمنائیں لے کر آتا ہے۔مگر ساتھ صرف ایک ہی خواہش لے کر جاتا ہے کہ کاش میں تھوڑی دیر اور جی پاتا مگر یہ تمنا نہ کسی کی پوری ہوئی ہے اور نہ شاید کبھی ہو۔انسان سدا کا بھوکا ہے وہ ایسا ہی رہے گا۔کیونکہ یہ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔انسان بند آنکھوں سے دنیا میں آتا ہے اور بند سے ہی چلا جاتا ہے مگر وہ آنے اور جانے کے درمیاں بہت کچھ دیکھ جاتا ہے۔☆ **مساوات۔۔** زندگی بے بس خاموش پرندے کی طرح وقت کو اُڑاتی دبے پاؤں کٹے جارہی ہے۔جیسے کوئی ہوا اپنے ساتھ خس و خاشاک سب اُڑا لے جائے۔غم پھانس بن کر کبھی سانس روکتے ہیں مگر خوشی کا نوالہ نگلتے ہی سانس پھر بحال ہوجاتے ہیں۔یہاں کچھ ایسے ہیں۔جو ایک مسکراہٹ اور خوشی کے ایک پل کو ترستے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو خوشیوں سے دامن بھرے چاندسی ٹھنڈک میں زندگی گزارتے ہیں۔اور کچھ تو کفن بھی اُدھار کا پہنا کرتے ہیں۔پر یہاں مساوات ہے کیونکہ قبر امیر اور غریب کی ایک ہی مٹی سے تیار ہوتی ہے۔☆ **ماضی،حال،مستقبل۔۔** خوش رہو اور پیچھے مُڑ کر نہ دیکھو کہ ماضی راکھ کا ڈھیر ہے۔پاؤں مضبوط رکھو کہ حال سمندر کی ریت کی طرح لمحہ بہ لمحہ سرک رہا ہے۔اور آنکھیں کھلی رکھو کہ مستقبل تاریک خلاء ہے ۔انسان کسی کو شریک زندگی بنانے سے پہلے اس کے حال اور ماضی کو دیکھتا ہے۔لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی رفاقت میں اس کو مستقبل گزارنا ہے۔

کتب پر تبصرہ

رشید قیصرانی

''کنارِ زمین تک''

کلام رشید قیصرانی پر تبصرہ

رشید قیصرانی مرحوم ایک ایسی نامور اور عہد ساز شخصیت تھے جس نے اردو شاعری ادب کو ایک نئی لغت نئے منظر سے آشنا کیا اور اس طرح اس صنف سخن کی پوری کائنات کو متاثر کیا ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹر انور سدید ان کی شاعری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔'' رشید قیصرانی نے کتابی غزل کہنے کی بجائے غزل کی نئی کتاب مرتب کی ہے۔ یہ غزل جو غالب کی جدیدیت کے بعد رکی سی نظر آتی تھی۔ رشید قیصرانی نے اسے اپنے لمس سے لفظوں کی بیاض عطا کی ہے''۔

اس پر مزید لکھتے ہیں:۔'' رشید قیصرانی نے اردو غزل کو نئی زمینیں، نئے تماثیل اور نئے علائم و رموز عطا کئے ہیں اور یوں اس نے ملتان میں بیٹھ کر دلی، لکھنو اور لاہور کو متاثر کر ڈالا ہے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ رشید قیصرانی نے جس والہانہ پن سے خالقِ کائنات سے عشق کا اظہار کیا ہے پروفیسر عرش صدیقی مرحوم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔'' رشید قیصرانی کے دوہوں میں سرشاری اور بے خودی کی جو کیفیت ہے وہ محبوب کے سامنے اپنی ذات کو ختم کر دینے، والہانہ پن سے اُسے چاہنے اور اس کی عنایت کے لئے دستِ سوال دراز رکھنے سے ہوتی ہے جس خوشبو سے یہ شاعری معطر ہے وہ آج کل کمیاب ہے عصر نے اُن کی سائیکی میں ڈوب کر زمانوں کی اس جذباتی اکائی کی وسعت حاصل کر لی ہے جو صرف صوفیاء کے ہاں ملتی ہے محبوب کی ذات کے ساتھ کائنات اور خالقِ کائنات کی ذات سے قربِ باطنی کا جذبہ موجزن ہے، یار من گیا تو ساری کائنات بانہوں میں آ گئی، رشید قیصرانی کے ہاں لرزاں مہجوری کا درد صرف صوفیانہ سطح پر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے''۔ (رشید قیصرانی فن اور شخصیت مرتبہ خالد اقبال یاسر)

محسوسات کا شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آدم چغتائی

جناب ساحر شیوی صاحب فرماتے ہیں

جناب آدم چغتائی کی کتاب ''جستجوئے جمال'' منظر عام پر آ چکی ہے۔ جو کہ دو صد بیس صفحات کی یہ کتاب اعلیٰ کاغذ، دیدہ زیب، آفسیٹ پرنٹڈ، مجلد، اور ایک سو چوبیس ،قطعات، نظمیں، غزلیں، نعتیں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ساحر شیوی فرماتے ہیں۔ جناب آدم چغتائی برطانیہ کے ایک فعال اور قادر الکلام شاعر ہیں ان کی شعر گوئی نے انھیں برطانیہ میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے متعارف کروایا ہے۔ جناب آدم چغتائی نے یوں تو سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ جناب آدم چغتائی کی غزلیں اپنے موضوعات، اندازِ بیان اور فکر میں پڑھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ جناب آدم چغتائی نہ صرف شاعر ہیں بلکہ کئی ادبی انجمنوں کے متحرک کارکن بھی ہیں۔ برطانیہ میں انہوں نے کئی ادبی انجمنیں قائم کی ہیں اور ان کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ آدم چغتائی کے اندر کا شاعر انسانی کائنات اور معاشرے کے مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اسے محسوس کرتا ہے۔ اور اسے بیان کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ شاعر چونکہ ایک حساس دل، دل و دماغ کا مالک ہوتا

ہے اس لئے وہ عام انسانوں کی بہ نسبت ان عوامل اور حادثات کو پہلے ہی محسوس کر لیتا ہے۔ جو صفحہ دہر پر رقم ہونے والا ہوتا ہے۔ آدم چغتائی چونکہ ایک مسلم الثبوت شاعر ہیں اس لئے وہ ان مناظر، واقعات اور ایسے بے شمار مشاہدات کو الفاظ و بیان کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اگر اس واقعے سے گزرا ہے تو اسے آدم چغتائی کی شاعری متاثر کرے گی۔ دیگر احباب کے لئے ان کی شاعری میں لطف و انبساط کا سامان تو ملے گا ہی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ماہنامہ ''پرواز'' لندن کے باقاعدہ تخلیق کاروں میں آدم چغتائی کا نام بہت اہم ہے۔ میں آدم چغتائی کو اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

گزارش

یہ انٹرنیٹ میگزین شعروادب کی خدمت کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اس میگزین کا کسی خاص فرقے یا گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو ادب کی خدمت کے لئے ہر کوئی اس کے لئے لکھ سکتا ہے۔ اور اسے پڑھ سکتا ہے۔ یہ کبھی بھی کسی کی دل آزاری کے لئے استعمال نہیں ہوگا۔ البتہ انسانیت کی خدمت کے لئے یہ وقف رہے گا۔ البتہ اس کا ممبر بننا ضروری ہوگا۔ جو اس کا دو پونڈ ماہانہ ممبری چندہ یا سالانہ ۲۴ پونڈ ادا کر کے ممبر شپ حاصل کرے گا۔ اس کی ارسال کردہ تحریرات معیار کی جانچ پڑتال کے بعد اس کی باری آنے پر شائع کر دی جائیں گی۔ آپ کوئی انٹرویو، افسانہ، غزل، گیت، رباعی، یعنی کہ اردو ادب یا پنجابی ادب کے متعلق بھی کچھ ارسال سکتے ہیں۔ اپنی تصویر بھی ساتھ ارسال کریں۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس میں نئے اور پرانے شعراء کا کلام آپ کو پیش کرتے رہیں۔ اس میگزین کی ویب سائٹ کا نام www.bazmesherosukhan.co.uk ہے۔ اس پر آپ مختلف تازہ مشاعرے بھی سن سکیں گے۔ اور ممتاز شعراء کے انٹرویو بھی سُن اور پڑھ سکیں گے۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہ سائٹ آپ سب کے لئے مفید اور کارآمد ہو۔ اور دعا کریں کہ خدا تعالیٰ ہمیں اردو ادب کی خدمت کی توفیق دیتا چلا جائے۔ آمین۔ آپ کا مخلص

رانا عبدالرزاق خاں